مولانا سید محمد رابع ندوی ۔ ناظم ندوۃ العلماء ۔ لکھنؤ

دینی مدارس اور ان کا نصاب

مدارس عربیہ کا نصاب در اصل مسلمانوں کی گزشتہ صدیوں میں رائج نصاب درس سے ماخوذ رہا ہے۔ یہ قدیم نصاب اگرچہ گزشتہ صدیوں میں حالات اور تقاضوں کے مطابق بدلتا رہا تھا اور مضامین کے سلسلہ میں کمی وبیشی کا عمل جاری رہا تھا لیکن معقولات کی جو اہمیت چوتھی پانچویں صدی ہجری سے عالم اسلام کے علمی حلقوں میں پیدا ہو گئی تھی، وہ اس میں جاری رہی۔ اس کے اثر سے ذہنوں میں بحث وجدل کا مزاج بنتا تھا اور عملی اور تجربی علوم کی رغبت کم ہوتی تھی۔ نیز علوم دینیہ کی بھی جو کتابیں تصنیف ہوئیں، ان کا طرز بیان معقولات سے متاثر رہا۔

برصغیر میں بھی گزشتہ صدیوں میں یہی طرز غالب رہا۔ اخیر میں درس نظامی کے نام سے جو نصاب رائج ہوا، وہ اصلاً ملا نظام الدین فرنگی محلی کا اختیار کردہ تھا اور اس میں معقولات کو وسیع مقام دیا گیا تھا۔ اس میں علوم دینیہ میں حدیث کو بھی وہ وسعت حاصل نہیں تھی جو اس کے لائق ومناسب تھی لیکن اس کمی کو متعدد علماء حق نے محسوس کیا جن میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی کی توجہ کا بڑا حصہ تھا، چنانچہ علماء حق کی اس توجہ سے صحاح ستہ کی تعلیم کو خاصی اہمیت حاصل ہوئی اور نتیجتاً ان کو بالاستیعاب ایک سال میں پڑھا دینے کا سلسلہ شروع ہوا جو تمام مدارس دینیہ میں رائج ہو گیا۔

مذکورہ بالا گزشتہ عہد پوری اسلامی دنیا کے لیے سخت انحطاط اور علمی لحاظ سے جمود کا زمانہ تھا، مغربی قومیں ترقی کر رہی تھیں اور مشرقی قوموں پر غالب آتی جا رہی تھیں، مسلمانوں نے مفید اور تقاضائے وقت کے مطابق اپنے کو تیار کرنے اور ضرورت کے علوم ومعارف سے واقف ہونے کی طرف توجہ ختم کر دی تھی اور نصاب درس کے معاملہ میں بھی کسی بڑی تبدیلی کے لیے اپنے کو تیار نہیں کر پا رہے تھے۔ ایسے میں مغربی قوموں کے غلبہ نے اور بھی خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ ہندوستان میں مغلوں کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا، اور ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی زندگی کو مختلف میدانوں میں ابھرنے اور اپنی صفیں مضبوط کرنے کا موقع ملے۔ اس کے لیے تعلیم بہت بڑا عامل تھا جس کو درست کرنے اور وقت کے مطابق بنانے

کی ضرورت تھی لیکن وہ جمود اور محدودیت کا شکار تھی۔

لیکن پھر بھی مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے کے سبب سے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کو عقائدی اور اخلاقی سطح پر جو زبردست چیلنج کا سامنا کرنا پڑنے لگا تھا' اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اس وقت کے علماء و مصلحین نے جن میں خاص طور سے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے ذی علم افراد تھے' خاص توجہ صرف کی اور اس جدوجہد کو اس وقت کی جو علمی وتعلیمی بنیاد درکار تھی' وہ مہیا کی۔ ان کی کوشش سے علم وتعلیم سے جو دلچسپی بڑھی' اسی سے موجودہ دینی مدارس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے لیے اس وقت جو نصاب تعلیم اپنایا گیا' اس میں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کی صحیح اور موثر تعلیم' مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرہ کو اسلامی بنانے کی ضرورت کے لائق مضامین وکتب نیز عقائد صحیحہ کو غلط اور گمراہ طریقے سے پیش کرنے والوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے والے علوم بھی شامل کیے گئے' ان کے اور علوم شرعیہ کے ساتھ حسب سابق علوم عقلیہ وآلیہ کو بھی شامل نصاب رکھا گیا' اس نصاب کو تقویت ورواج زیادہ تر دار العلوم دیوبند میں اس پر عمل کیے جانے سے ہوا۔ دار العلوم دیوبند جس کو اپنے وقت کے عظیم عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پروان چڑھایا اور ان کے رفقاء کے تعاون سے اس کو عظمت وشہرت حاصل ہوئی' وہ سب حضرات اپنے وقت کے شیوخ اور بزرگ تھے۔ مولانا رشید احمدؒ گنگوہی' شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ دیوبندی اور ان کے بعد کے بزرگ علماء مولانا حسین احمدؒ مدنی' مولانا شبیر احمدؒ عثمانی' مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب قاسمی وہ بزرگ علماء تھے کہ جن کے کام اور اقدام میں اثر وبرکت تھی۔ وہ کسی معمولی سے معمولی نصاب کو چلاتے تو اس سے بھی موثر نتائج نکلتے کیونکہ ان کی بات میں اثر تھا' ان کی ہدایت ونصیحت میں اثر تھا' ان کی تعلیم وتربیت میں اثر تھا۔ ان کے اثر سے اسی دار العلوم دیوبند کو دور دور تک شہرت ہوئی اور وہاں آنے والے طلباء درس گاہ کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ وہاں کے ان عالی قدر مدرسین سے ہمت وقوت وجذبہ حاصل کرتے رہے جو ان کی عملی زندگی میں دوسروں کے فیض کا بھی باعث بنا رہا لیکن جہاں تک نصاب کا تعلق تھا' اس میں وقت اور حالات کے لحاظ سے جو کمی پائی جاتی تھی' اس کو دور کرنے سے وہ نصاب اور زیادہ مفید اور ملت کی ضرورت کو پورا کرنے والا بن جاتا جس کو تقریباً محسوس نہیں کیا گیا۔

حالانکہ تفسیر وحدیث وفقہ جو علوم عالیہ کے عنوان میں داخل تھے' ان میں تغیر وتبدل کی ضرورت نہ تھی البتہ علوم آلیہ نحو وصرف وادب کی تعلیم میں نئے تجربوں میں آئے

ہوئے طریقوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا اور علوم عقلیہ کی مقدار میں فرق کر کے ملت کی ضرورت کے علمی و اجتماعی پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے مضامین کا ضروری حصہ داخل کیا جا سکتا تھا لیکن بزرگوں کی برکت سے جو نفع حاصل ہو رہا تھا' اس کی روشنی میں مذکورہ بالا ضرورت کو ٹھیک سے محسوس نہیں کیا جا سکا اور اسی نصاب کو برابر قائم رکھا گیا۔ اس کے اثر سے نصاب تعلیم کے یہ مشمولات تقریباً" تمام مدارس اسلامیہ دینیہ میں رائج رہے' اس نصاب میں زیادہ اور تفصیلی طریقہ سے زور صرف چار موضوعات پر دیا گیا۔ ایک حدیث' دوسرے فقہ' تیسرے تفسیر اور چوتھے معقولات و قواعد عربی۔ پورا نصاب تقریباً" ان ہی چار موضوعات پر مشتمل رکھا گیا' اس نصاب کو پڑھ کر انہی علوم میں جید علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی عقائد کی ترویج کی اور مسلمانوں کی زندگی اصلاح کی اور گمراہ کرنے والے لوگوں کی کوششوں کا مقابلہ کیا اور ان کا ابطال کیا۔ آج ملک میں عقائد صحیحہ کے بقاء اور صحیح مذہبی زندگی کے رواج میں ان اسلاف کی ان کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ یہ وقت جبکہ ملک میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھ رہا تھا اور ان کی حکومت سے مسلمانوں کے لیے بڑے خطرات محسوس کیے جانے لگے تھے' اسلام وملت اسلام کے تحفظ کے لیے جو کوششیں جاری تھیں' ان کے لیے بھی خطرات پیدا ہونے لگے۔ یہ بدیسی حکومت مسلمانوں کے ملکوں میں سیاسی سطح پر نہ صرف یہ کہ اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہی تھی بلکہ تہذیبی اور علمی طور پر بھی سخت اثر انداز ہو رہی تھی' اس کی تہذیب کا غالب قوم کی تہذیب کی حیثیت سے اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے سامراجی مقاصد سے ذہنوں کو بدلنے اور اپنی مصلحتوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اپنا مخصوص تعلیمی نظام بنایا اور اس کو رائج کیا۔ چونکہ اس تعلیمی نظام سے دنیاوی وجاہت اور ترقی حاصل ہوتی تھی' اس لیے باوجود اس کی مضرتوں کی طرف توجہ دہانی کے مسلمانوں کی نئی نسلوں کے لیے یہ نظام تعلیم قابل قبول بنتا گیا' چنانچہ نئی نسلوں کے لوگ اس کی طرف غول در غول جانے لگے۔ اس طرح مسلمانوں میں دو نظام تعلیم جاری ہو گئے۔ ایک کا محور خالص علم دین تھا' دوسرے کا محور خالص دنیا۔ یہ دو دھارے بن گئے' دینی تعلیم کا دھارا صرف دینی' اور دنیاوی تعلیم کا دھارا دنیاوی دائرے میں چلنے لگا۔

علمائے اسلاف نے اسلامی زندگی کی حفاظت اور عقائد صحیحہ کی ترویج ودفاع کے لیے اپنے نظام تعلیم میں جو حق رکھا تھا' اس میں اصلاً" گمراہ فرقوں اور علمائے سوء کے مقابلہ کا انتظام تھا چنانچہ اپنے اس تعلیمی نظام سے اس کے لائق علماء تیار کیے جن کی بڑی دینی خدمات ہیں۔ لیکن استعماری طاقت کے اثر سے نئے گمراہ کن فکری رجحانات اور اسلامی ثقافت

ومذہب کو نقصان پہنچانے اور ذہنوں سے ان کے اثرات ختم کرنے کی کوششوں کے مقابلہ کے لیے اس نصاب میں انتظام نہ تھا' مثلاً تمدنی علوم' قوموں کی تاریخ نیز موثر ورائج زبان' سیاست واقتصاد وجدید علوم کا کوئی نظم نہ تھا کہ اس کے ذریعہ دشمن کے تفوق کا مقابلہ کرنے کے اوزار ملتے۔ البتہ اس کمی کو ان میں سے متعدد علماء نے محسوس کیا اور حتی الوسع اس پہلو کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی۔ ان کی اس فکر وتوجہ سے مسلمانوں کے نصاب میں اس کی ضرورت کے لیے جگہ نکالنے کی کوشش شروع ہوئی۔ یہ کوشش ایک دعوت وفکر کی صورت میں ظاہر ہوئی اور ندوۃ العلماء نامی ادارہ کے نام سے اس نے کام شروع کیا۔ یہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء کا زمانہ تھا۔

ان کی تجاویز نصاب میں فکری وثقافتی وانسانی ضرورت کے مضامین اور عہد کے مطابق زبان وادب کی صلاحیت پیدا کرنے والے موضوعات بھی پیش نظر تھے۔ اس دائرے میں عربی زبان کو وسیع اور اہم جگہ دی گئی تھی' تاکہ اس میں ایسی قابلیت پیدا کرنا ممکن ہو جو ملت اسلامیہ کے مختلف علاقوں کے درمیان ربط کا ذریعہ ہے اور علوم اسلامیہ سے گہری واقفیت کا وسیلہ بننے کے ساتھ دعوتی زندگی میں استعمال بھی کی جا سکے کیونکہ عربی زبان اسلام کی بنیادی زبان ہونے کے ساتھ مسلمانوں کی درمیانی واسطہ کی زبان بھی ہے جس پر علماء کو عملی عبور رکھنا ضروری امر ہے۔ ثقافتی وانسانی ضرورت کے موضوعات میں تاریخ رکھی گئی' تاریخ درحقیقت ایک وسیع الاطراف موضوع ہے جس میں قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ' ثقافت وتمدن کی تاریخ' دعوت وفکر اسلامی کی تاریخ' استعماری طاقتوں کی سیاسی قوت اور علمی وفکری غلبہ کی تاریخ' مسلمانوں کے آغاز تمدن وغلبہ کی تاریخ' پھر ان کے زوال وشکست خوردگی کی تاریخ' جس میں ان کے اسباب وپس منظر شامل ہیں۔ تاریخ کے علاوہ علمی وفکری میدان میں اس صلاحیت کا پیدا کرنا جس سے قرآن وحدیث' سیرت طیبہ پر مستشرقین کے شرارت آمیز حملوں کو سمجھنے اور پھر ان کا علمی جواب دینے کے قابل بنایا جا سکے اور ایسے مفکرین وداعی پیدا کیے جا سکیں جو دین کا دفاع ہی نہیں بلکہ علم وتحقیق کی راہ سے حملہ آوروں کو شکست دے سکیں۔ اس کے لیے اپنے مقابل کی زبانوں سے ضروری واقفیت اور استعمال کی قدرت درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک طرف خود اپنے ملک وقوم میں رائج الوقت زبان پھر یورپ کی غالب قوم کی زبان سے واقفیت' جس کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو فرسودہ اور ازکار رفتہ بلکہ احمقانہ قرار دینے کا عمل جابجا ہو رہا تھا۔ پھر صرف غیر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی نئی نسل کی اکثریت غالب قوم کی زبان کے ذریعہ متاثر ہو کر ان کے خیالات کو

اپنا رہی تھی۔ اس پر عبور حاصل کر کے مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم یافتہ اکثریت کو ان منحرف خیالات ومعلومات سے بچانے کا کام انجام دیا جا سکتا تھا۔ اس میں ثقافت وادب پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ انگریزی زبان وادب سے واقفیت کی بڑی اہمیت تھی۔ زبان کے علاوہ اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے ضروری علمی معلومات جیسے جغرافیہ اور عمرانی وثقافتی علوم اور دیگر اہم عصری موضوعات بھی ضروری تھے۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات یہ بتا رہے تھے کہ کسی بھی زندہ قوم کے نصاب تعلیم میں ان مذکورہ بالا پہلوؤں کو نظر انداز کرنا قوم کو اس کی باعزت زندگی سے محروم رکھنے کے مساوی ہے اور قوم کو قائدانہ صف کے بجائے پچھلی صف میں تابع بن کر رکھنے کی طرف لے جانے والی بات ہے۔

نصاب کی تشکیل میں وسیع النظری کی ضرورت

نئے عہد کی ترقیات اور جدید علوم کے رواج سے یہ بات حقیقت بن گئی ہے کہ بغیر ان علوم کو جانے ان کے شر کا مقابلہ اور اپنی دینی اور اخلاقی اقدار کا دفاع کرنا دشوار ہے۔ کوئی بھی قوم ہو، اپنے صرف مخصوص علمی دائرے کے اندر محدود رہے گی تو دوسری قوموں اور ان کی ترقیات سے ناواقفیت کی بنا پر نقصان اٹھائے گی۔ مزید یہ کہ دوسری قومیں جن راہوں اور ذریعوں سے ترقی کر کے دوسروں پر غالب آرہی ہیں، ان سے ناواقفیت پر اس قوم کو نہ صرف خسارہ میں رہنا پڑے گا بلکہ ان غیروں کا دست نگر اور تابع مہمل بننا پڑے گا۔ عالم اسلام کی قوتیں کئی صدیوں سے اس احساس میں مبتلا رہی ہیں اور ابھی کچھ تھوڑی بیداری کے باوجود اس ورطہ سے نہیں نکل سکی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اہل دین، جن کی قیادت و رہنمائی میں وہ جامع اور موثر رہنمائی بنتی ہے جس کے اثر سے مسلم قوم عظمت و قوت کے میدان سر کر سکتی ہے، وہ عظمت و قوت کے حصول کے لیے قدیم اختیار کردہ ذرائع کو مقاصد کا درجہ دینے لگے ہیں اور ذرائع کے معاملہ میں روز افزوں تجربوں سے جو تبدیلی اور بہتری کی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں، ان کو اختیار کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ علم وثقافت کے میدان میں اس عہد اخیر میں جو توسع پیدا ہو چکا ہے، اس کو بھی ہمارے اہل دین اپنے نظام تعلیم میں نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے دینی نظام تعلیم کی بقاء وکامیابی کے سلسلہ میں بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم کو علم وثقافت کی اس وسعت کو سمجھنا اور اس کے ضروری حصہ کو لینا ہوگا۔ اس کے لیے اس وقت علم و ثقافت میں جو وسعت پیدا ہو گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے نظام درس کے تمام علوم و مضامین کی اصناف طے

کر کے ان میں سے ہر ایک کی ضرورت و اہمیت کے لحاظ سے اس کو نظام تعلیم میں جگہ دینا ہوگی اور ان کی الگ الگ مقدار متعین کرنا ہوگی۔ کسی علم و مضمون کو وسیع اور بنیادی درجہ دینا ہوگا اور کسی کو صرف ضمنی اور متعلق کا درجہ دینا ہوگا۔

اسکول ہوں یا مدارس، یونیورسٹیاں ہوں یا جامعات اسلامیہ، سب کو اپنے مقصد کے مطابق ہی علوم و مضامین درس کی تعیین و ترتیب کا عمل کرنا ہوتا ہے۔ عصری اسکول اور یونیورسٹیاں تعلیمی عمل سے کامیاب اور کار پرداز شہری تیار کرنے کا مقصد رکھتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب و کارپرداز شہری کے لیے جن علوم کی جو اہمیت اس کی انفرادی ضرورت کے لیے اور عام قومی و وطنی ضرورت کے لیے ہوتی ہے، اس اہمیت اور ضرورت کی مقدار کے مطابق ان علوم کو اختیار کرتے ہیں اور ان کی تعلیم کا اور ان کی تدریب کا نظم کرتے ہیں۔ اس میں زبان و ادب، سماجی علوم اور سائنسی علوم کی بڑی شاخوں کو لیا جاتا ہے۔ اگر یہ اسکول و کالج اسلام بیزار نہیں ہیں تو سماجی علوم کے اندر مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کو ایک چھوٹا سا حصہ دے دیتے ہیں اور اس کو کافی سمجھتے ہیں اور اگر مذہب بیزار ہیں تو مذہبی تعلیمات کو شامل ہی نہیں کرتے بلکہ ان کو مضر سمجھتے ہیں۔

مذہب پسند اسکول و کالج بھی یورپ سے متاثر ہونے کے باعث مذہبی تعلیمات کے لیے اپنے نظام میں بہت معمولی جگہ نکالتے ہیں، اس سے کسی حد تک مذہبی تعلیمات سے تعارف تو پیدا ہو جاتا ہے لیکن مذہبی تعلیمات سے ضروری واقفیت نہیں ہوتی۔ ان کو بھی اپنے نظام تعلیم کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ استعماری طاقتوں کے چھوڑے ہوئے نظام میں وہ اپنی ضرورت اور خصوصیت کے لحاظ سے ضروری ترمیم بھی ابھی تک نہیں کر سکے۔ اسی وجہ سے اس نظام تعلیم سے تیار ہونے والے لوگ مسلمان شہری کم، مغربی شہری زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر وہ شان و شوکت و عظمت کے حامل مغرب کی عطا کردہ تعلیم کے حامل ہونے کے باعث ایک طرح سے زائد احساس برتری بھی رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ علماء اور اہل دین کو علم و تعلیم کے مسئلہ میں خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے تجربوں کو کم از کم واقفیت کے حصول کے لیے بھی ٹھیک سے معلوم کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ ان کی کمی ہے جس کی طرف ان کو توجہ کرنا چاہیے۔

دوسری طرف ہمارے قدیم نصاب کے دینی مدارس میں جنہوں نے حالات زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے اپنے نصاب میں تجدید و توسیع نہیں کی ہے جس کے سبب ان کے فضلا زندگی کے ان شعبوں میں صحیح واقفیت سے محروم رہ جاتے ہیں جس میں واقفیت وقت کے

اہم تقاضوں میں ہے۔

لیکن اس کے باوجود خالص دینی ضرورت اور صرف مذہبی علوم میں واقفیت کے دائرے میں ان کی افادیت غیر معمولی ہے اور ملک میں شریعت اسلامی کی حفاظت و بقاء کا اصل سہرا انہی فضلاء کے سر ہے۔ ان مدارس کے نصاب میں ان کے علوم سے مطابقت رکھنے والے مضامین کا اضافہ تو ضروری ہے لیکن ان کے ساتھ ٹیکنیکل تعلیم کو ملانے کی دعوت دینا بے جوڑ بات ہے۔ پھر ان مدارس کو ان کے محدود دینی دائرے میں رہنے دیا جائے تو کم از کم اس دائرے کی ضرورت کا نظم تو ان کے ذریعہ قائم رہے گا جو بذات خود ایک بہت مفید بات ہے۔ پھر ان مدارس کی تعداد پورے نظام تعلیم میں دو تین فیصد سے زیادہ نہیں ہے' اتنی تعداد سے زیادہ تو علوم عصریہ کے نظام میں ایک ایک صنف میں محدود ہو کر تعلیم حاصل کرنے والوں کی ہے' مگر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ میڈیکل کالج میں انجینئرنگ بھی سکھائی جائے یا انجینئرنگ کے شعبہ میں میڈیکل سائنس بھی پڑھائی جائے۔ قانون کے شعبہ میں آرٹ کی تعلیم بھی ضرور رکھی جائے۔ اسی صورت میں یہ مطالبہ کہ عربی اور اسلامی مدرسوں میں ٹیکنیکل علوم باقاعدہ پڑھائے جائیں' ایک بے وزن قسم کا مطالبہ ہے۔ البتہ ثبعیات کے مبادیات کو ان کے کسی مرحلہ میں شامل کرنے میں حرج نہیں' لیکن ان دینی مدارس میں ان کے بنیادی علم کو کم کر کے جن کا وہاں اختصاص پیدا کیا جا رہا ہو' طبعی علم کو وسیع جگہ دی جانے کی بات کہی جائے تو بغیر غور کے کہی جانے والی بات شمار ہوگی۔ البتہ دوسری طرف مدارس اسلامیہ عربیہ سے جو بات کہنے کی ہے' وہ یہ ہے کہ قوم و ملت کی رہنمائی اور اس کی مذہبی واخلاقی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ان مدارس میں جو آدمی تیار کیے جا رہے ہیں' ان کی ضرورت کے لائق مضامین کا انتخاب اور ان کی تعلیم کا بہتر سے بہتر طریقہ جو خواہ اپنوں کے تجربوں میں آیا ہو خواہ غیروں کے تجربے میں' ان کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ ان سے گریز اپنے نظام کو ناکام بنا دینے کے مترادف ہوگا۔

مدارس اسلامیہ عربیہ کے علوم کے اصناف کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان علوم کی اصناف بھی تین ہیں۔ ایک مذہبی بنیادی علوم کی' دوسرے اسلامی ضرورت کے لسانی وسماجی علوم کی' تیسرے زندگی کے متعلق عام معلومات کی۔ یہ زندگی وہی ہے جس میں علماء دین اور رہبران ملت کو بھی رہنا ہوتا ہے۔ کیا وہ ان کے بارے میں ایک ان پڑھ دیہاتی کی طرح رہنا چاہیں گے؟ اگر ایسا نہیں تو زندگی کی اس ضرورت کے تعلق سے ان کو واقفیت پیدا کرنا ہوگی اور جہاں تک سماجی علوم کا تعلق ہے تو وہ اسلامی تعلق کے لحاظ سے بھی بڑی

اہمیت کے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کی اسلامی فکر وثقافت کو سائنسی علوم سے نقصان نہیں پہنچتا۔ وہ تو تسلیم شدہ اور مشاہدہ سے ثابت شدہ حقائق ہوتے ہیں جو فطری ہیں۔ وہ کسی مذہب سے متصادم ہوں تو ہوں، اسلام سے کہیں متصادم نہیں ہوتے ہیں۔ اصل نقصان تو سماجی علوم کو مخالفانہ یا معاندانہ انداز میں مرتب کرنے اور پیش کرنے سے ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے جن سے یورپ پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس طرح ادب و زبان سے اچھی واقفیت اور ان پر قدرت بھی ذہنوں کو جتنا متاثر کرتی ہے، دوسری صلاحیتیں مشکل سے اتنا اثر انداز ہوتی ہیں۔ یورپ کی قومیں اور ان کے مشرقی شاگرد علوم و آداب کے میدان میں اس وقت جتنے قابو یافتہ ہیں، وہ کوئی مخفی بات نہیں، پھر یہ مغربی ذہن کے لوگ سماجی علوم کی راہ سے مشرقی ذہنوں کو مسلمانوں کے سرمایہ فکر و ثقافت بلکہ عقائد و مسلمات کے سلسلہ میں جتنا متزلزل کرتے رہے ہیں اور کر رہے، اس نے اسلامی فکر وعقیدہ کے لیے ایک بڑا خطرہ کھڑا کر دیا ہے۔ ان کی اکثریت اس میدان میں بھی ہے اور ذرائع ابلاغ و ادب کے میدان میں بھی ہے اور ان کو ان کی مہارت بھی زیادہ ہے۔ اس صورت حال میں اگر موثر اور طاقت اور ذرائع اختیار نہیں کیے گئے تو بنیادی دینی علوم کی حفاظت اور دفاع بھی زیادہ عرصہ تک نہ کیا جا سکے گا۔ دشمن کو اس کے ہتھیار سے ہی شکست دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں سماجی علوم کا بھی حصہ شامل کیا جائے۔ اور عصری زندگی سے تعلق رکھنے والی ضروری معلومات بھی خواہ بقدر تعارف ہوں، رکھی جائیں۔ اسی کے ساتھ زبان وادب کو بھی وہ مقام دیا جائے، جس کی ضرورت حالیہ عہد کے لحاظ سے محسوس کی جا رہی ہے۔ مضامین کے اس تنوع وتوسع اور درجہ بندی کے لیے تعلیمی مدت بھی اسی کے مطابق کرنا ہوگی۔ اس کے لیے عصری تعلیم گاہوں کا مرحلہ واری طریقہ اپنانا مناسب ہے۔ جہاں تعلیمی مدت ابتداء سے انتہا تک ۱۶، ۱۷ سال کی ہوتی ہے۔ شروع کے پانچ سال ابتدائی کے، پھر تین سال متوسط کے، پھر دو تین سال ثانوی کے پھر چار سال عالی کے، پھر دو سال اعلیٰ و تخصص کے۔

ابتدائی ومتوسط درجات میں ابتدائی دینیات اور زندگی کے متعلق عام بنیادی معلومات ومضامین پڑھانا موزوں ہے جو ان درجات کے طلباء کی عمر کے مطابق سہل الفہم ہوں۔ پھر ثانوی میں مضامین کچھ محدود کیے جائیں اور بنیادی ضرورت کے مضامین کو زیادہ وقت اور اہمیت دی جائے۔ اپنے اپنے مقصد کے مطابق ان کا تعین ہو۔ پھر عالی میں خالص اپنے مقصد کے ساتھ مخصوص مضامین ہی ہوں۔ مثلاً علوم دینیہ وسیع اور بنیادی طور پر اور سماجی علوم

تھوڑے اور محدود ضرورت کے لیے۔

جامع دینی تعلیم کا ایک تجربہ ۔ ندوۃ العلماء

دراصل موجودہ بدلتی ہوئی دنیا کے پیش نظر ضرورت تھی کہ علوم دینیہ واسلامیہ کی وسعت کا حق ادا کرتے ہوئے وقت کے تقاضا کا خیال رکھا جائے۔ علوم اجتماعی میں متعدد علوم وسیع اور مفید علم بن چکے ہیں جن سے عالمانہ واقفیت کے بغیر نہ تو ان سے پیدا ہونے والے اثرات کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ مشرق پر اس کے جو گوناگوں منفی اثرات پڑ رہے ہیں' ان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک مسلمان کو اگر اسلام سے نبرد آزما طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہے' اور اپنے کو اپنی امت کو ان کے شر سے بچانا ہے تو اس کو ان تمام موضوعات سے کسی نہ کسی حد تک واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

ندوۃ العلماء کی اصلاح نصاب کی دعوت نے اپنے قیام ۱۸۹۳ء سے ہی وقت کے تقاضا کے مطابق نصاب تعلیم کی تشکیل کی اہمیت کو محسوس کیا تھا اور اس کی دعوت دی تھی۔ اس کے لیے اس نے علوم دینیہ کا پورا حق رکھتے ہوئے ضروری نئے موضوعات کو شامل کرنے کا خاکہ مرتب کیا اور نصاب بنایا' اور کام کی ابتداء کی۔ لیکن اس کو جن وسائل کی ضرورت تھی' وہ اس کو لوگوں کی طرف سے توجہ نہ ملنے اور تعاون کم دیے جانے کی وجہ سے نہ مل سکے۔ چنانچہ رفتار سست رہی اور ضرورت کے تمام گوشے اپنائے نہ جا سکے۔ پھر بھی اس کے اس تجربہ کے بتدریج نتائج سامنے آنے لگے تو اس تجربہ کو قریب سے دیکھنے والوں کو اس مسئلہ پر غور کرنے اور اس کے لحاظ سے قدم اٹھانے کی ضرورت کا احساس بڑھا۔ یہ اگرچہ خاصی تاخیر سے ہوا لیکن پھر یہ ایک خوش آئند عمل کہا جانے کا مستحق ہے۔

ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب کے مضامین کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک علوم دینیہ' جو اس کے نصاب کا غالب حصہ ہیں۔ دوسرے لسانی مضامین جن کو وقت اور ضرورت کے لحاظ سے قدیم اور جدید دونوں پہلوؤں سے اپنایا گیا ہے۔ تیسرے علوم اجتماعیہ' جو اسلام اور ملت اسلام کے تعلق سے ضروری ہیں۔ ان تینوں اقسام میں زیادہ توجہ علوم دینیہ پر' پھر لسانیات پر' پھر علوم اجتماعیہ پر دی گئی ہے۔ علوم دینیہ کے دائرے میں قدیم مدارس عربیہ کے نصاب سے تقریباً پوری یکسانی ہے۔ اس کے مروجہ نصاب میں کتر بیونت نہیں کی گئی۔ البتہ ان کو زیادہ وسیع مدت میں پھیلایا گیا ہے تا کہ وہ پورے ہو سکیں اور ان کا حق زیادہ بہتر طریقہ سے ادا ہو سکے۔ چنانچہ کتب حدیث و فقہ اسی مقدار میں اور تقریباً انہی کتب کی صورت میں شامل نصاب ہیں جو مروجہ درس نظامی کے نصاب میں داخل ہیں۔

درس نظامی کے دورۂ حدیث کی کتب کو ایک سال کے بجائے تین سالوں میں پھیلایا گیا ہے۔ اس سے قبل مشکوۃ شریف دو سال میں رکھی گئی ہے۔ پھر تین سال میں کتب صحاح رکھی گئی ہیں۔ فقہ میں مروجہ کتب کے ساتھ فقہ علی المذاہب الاربعہ سے بھی متعارف کرایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ مسائل حاضرہ کا تعارف بھی رکھا گیا ہے۔ تفسیر متن قرآن اور بیضاوی (بقرہ) پانچ سالوں میں مع اصول تفسیر داخل نصاب ہے۔ تغیر اور کمی کا عمل اصلاً" علوم عقلیہ قدیم میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ عہد اور تقاضے بدل جانے کی وجہ سے اب اسلامی علوم کی ترویج اور اسلامی فکر کا دفاع قدیم علوم عقلیہ کا زیادہ محتاج نہیں رہا۔ اب اس کی بڑی جگہ علم النفس، ادب اور لسانیات نے لی ہے۔ اس لیے منطق و فلسفہ کے صرف مبادی اور ضروری پہلوؤں سے تعارف کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ ضرورت جدید فلسفہ کو پڑھانے کی ہے جس کا رواج جدید علمی دنیا میں بڑھا ہوا ہے۔ لسانیات کے دائرے میں عربی زبان کی وسیع علمی وعملی تعلیم و مہارت کے ساتھ اردو میں اور اس کے بعد انگریزی، فارسی اور ہندی زبانوں سے واقفیت پیدا کی گئی۔ عربی اردو کے بعد دیگر زبانوں میں انگریزی زبان کی تعلیم کو زیادہ وقت دیا گیا ہے اور اس کو بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ وہ ابتدائی مرحلہ کے بعد شروع ہوتی ہے اور عالی مرحلہ میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ جہاں اس کے انٹر میڈیٹ تک کا نصاب پورا ہوتا ہے۔ علوم اجتماعیہ میں تاریخ، جغرافیہ، ثقافت اسلامی، اسلامی فکر اور منحرف فکر وباطل نظریات کا تعارف، اقتصادیات اور سیاسیات کے مبادی اور ریاضی وغیرہ نصاب میں رکھے گئے ہیں۔ نیز اہم مفکرین کے محاضرات کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے مراحل کو ابتدائی، ثانوی اور عالی اور تخصص کے مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان ہی کی مناسبت سے مضامین نصاب کی ترتیب وتنسیق رکھی گئی ہے۔

ابتدائی مرحلہ میں جو ۶ سالوں پر پھیلا ہوا ہے، ناظرہ قرآن و حفظ سور منتخبہ و تجوید، عقائد دینیہ و مسائل فقہیہ، اسلامی معلومات، تاریخ اسلام، اردو، ہندی، فارسی، حساب، جغرافیہ، معلومات جدیدہ اور خطوط نویسی، خوش خطی اور بعض دیگر معلوماتی اسباق ہیں اور عصری مدارس کی سطح کا معیار رکھا گیا ہے۔

ثانوی مرحلہ میں جو پانچ سالوں پر مشتمل ہے، عربی زبان و ادب و انشاء، اردو ادب و فارسی، انگریزی زبان، فقہ، معلومات دینیہ، سیرت نبوی، منتخب احادیث، صرف ونحو، تاریخ، جغرافیہ، حساب اور دیگر معلوماتی مضامین ہیں۔

درجات عالیہ کے چار سالوں میں ترجمہ و تفسیر قرآن اور متداولہ کتب تفسیر کی مراجعت نیز بیضاوی سورہ بقرہ و اصول تفسیر، صحاح کتب مع موطا واصول حدیث، فقہ، اصول

فقہ، عقائد، ادب عربی و انشاء، نحو، تاریخ، ادب، نقد ادب، تاریخ اسلامی، جغرافیہ اسلامی، ثقافت اسلامی، دعوت اسلامی، منطق و فلسفہ، سیاسیات و معاشیات اور انگریزی ہے۔

فضیلت و تخصص کے مرحلہ میں بقیہ کتب صحاح ہیں۔ مع طحاوی و اصول حدیث، علوم قرآن و تفسیر کشاف، اسرار عبادات، اسرار شریعت، فقہ و اصول فقہ، تاریخ علوم، ادب عربی و انشاء، تاریخ دعوت و فکر اسلامی، تراجم علماء واعلام، اصول تعلیم اور بعض دیگر مضامین شامل ہیں۔ قدیم مدارس دینیہ میں حدیث و فقہ کا جو نصاب دو یا تین آخری سالوں میں ہوتا ہے، وہ نصاب ندوہ نے مضامین کے اضافے کی وجہ سے پانچ سالوں میں پھیلایا ہے تاکہ وہ پورے ہو سکیں۔ اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ انگریزی اور عصری مضامین کے داخل نصاب کرنے سے علوم دینیہ کو نقصان نہ پہنچے۔ اس کے ساتھ دینی اخلاق و کردار کی حفاظت کے لیے اساتذہ اور نگرانی دارالاقامہ کے وسیع نظام سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح عصری مضامین اور انگریزی سے اسلامی اخلاقی کردار کو نقصان نہیں پہنچتا۔

جس کا کام مطلوبہ خطوط پر بتدریج انجام دیا گیا، جو نصاب تعلیم کے دائرہ میں اس تفصیل سے ہے جس کا سطور بالا میں تعارف کرایا گیا۔ یہ دینی تعلیم کو عصری تقاضوں کے ساتھ مربوط کرنے کے مقصد سے ہوا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے عصری مدارس و جامعات بھی انقلابی قدم اٹھائیں اور اپنے نصاب تعلیم میں وہ ضروری اضافہ کریں جس سے وہاں کے طلباء صرف علم ہی حاصل کر کے ہی نہ رہ جائیں بلکہ وہ اپنی اور امت اسلامیہ کی صلاحیت و مقام پر اعتماد بھی حاصل کر سکیں بلکہ دنیا کے سامنے اعتماد کے ساتھ اپنی اور دینی برتر خصوصیات سے اثر انداز ہوں۔ ضرورت ہے کہ وہاں کے ماہرین تاریخ موقر مغربی زبانوں میں اسلام و مسلمانوں کی تاریخ کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں اور بے اعتمادی پیدا کی گئی ہے، اس کو اپنی تصنیف کردہ ٹھوس علمی کتابوں سے دور کریں اور اسلام اور مسلمانوں کا شاندار چہرہ واضح کریں۔ اسی طرح دیگر سماجی اور انسانی علوم میں ایسا علمی سرمایہ تیار کر دیں جو مسلمانوں کا باعزت مقام بحال کرتا ہو اور نئی نسل کے کچے ذہنوں کی صحیح رہنمائی بھی کرتا ہو۔ یہ کام ہماری مسلم عصری درسگاہوں اور مسلم اسکالروں کے ذمہ قرض ہے جس کو انہیں جلد از جلد اتارنا ہے۔

تعلیم کا مقصد انسان سازی ہے۔ انسان سازی کا مطلب وہ انسان بنانا ہے جو اپنے مستند معتقدات، معتبر اخلاق اور پختہ دین وایمان کا حامل ہو نہ کہ ہر چمکتی چیز کا دلدادہ اور دوسروں کی کسی بھی برتری کے سامنے مبہوت ہو کر اپنی ہر خصوصیت کا منکر ہو جائے۔

(ماخوذ از "مسلمان اور تعلیم")